مگر کیوں؟

اس لیے کہ وہ اردو کی کتابیں ہیں۔

اچھی منطق ہے۔ اس منطق کا فائدہ سب سے زیادہ ان شاعروں کو پہنچتا ہے جو اپنے خرچ پر اپنا مجموعہ کلام چھپوا کر ٹی ہاؤس میں آ کر تقسیم کرتے ہیں۔ زاہد ڈار سے یہ سن کر کہ اس نے ان کا مجموعہ کلام پڑھا ہے' کتنے خوش ہوتے ہیں مگر جب رائے معلوم کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور رائے معلوم کی جاتی ہے تو اتنے ہی ناخوش بھی ہوتے ہیں۔ میرا جی کا یہ بیان وہ کتنے شوق سے دہراتا ہے کہ میری مادری زبان اردو ہے جو میری ماں نہیں بولتی۔ کہتا ہے کہ میری بھی مادری زبان اردو ہے جو میری ماں نہیں بولتی تھی۔

زاہد ڈار وقت کا بہت پابند ہے اور یہ چیز اسے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے پچھلے زمانے کے دیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بھلا ناصر نے کبھی سوچا تھا کہ ٹی ہاؤس کتنے بج کر کتنے منٹ پر پہنچنا ہے اور کتنے بجے تک بیٹھنا ہے۔ ناصر کی زندگی میں گھڑی کا سرے سے کوئی دخل ہی نہیں تھا مگر زاہد ڈار پابندی کے ساتھ دن ڈھلے عین چھ بجے ٹی ہاؤس میں قدم رکھتا ہے۔ نو بجے یہاں سے اٹھ جاتا ہے۔ اس پروگرام میں اگر وہ ایک گھپلا نہ کرتا تو میں اسے ڈپٹی نذیر احمد کے بعد دوسرا ڈپٹی نذیر احمد بتاتا مگر اس مقام کو اس نے اپنی حماقت سے کھو دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے بتایا ہے کہ پابندی سے روز دن ڈھلے ہارڈنگ لائبریری جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور وقت کے ایسے پابند کہ ادھر گھنٹہ گھر نے چار بجائے' ادھر ڈپٹی صاحب نے لائبریری میں قدم رکھا۔ چاندنی چوک کے دکاندار انہیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کرتے تھے۔ انہیں گھنٹہ گھر سے بڑھ کر اس گھڑی پر اعتبار تھا جس کا نام نذیر احمد تھا۔ زاہد ڈار کو ایسا شرف حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بیچ بیچ میں غوطہ جو کھا جاتا تھا۔ کتنے دنوں تک یاروں کو تجسس رہا کہ جب ٹی ہاؤس نہیں آتا تو پھر کہاں جاتا ہے۔ اب کی بات نہیں' پہلے کی بتاتا ہوں کہ اب تو رخ اور طرف ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہارا زاہد ڈار جس شام ٹی ہاؤس نہیں آتا' اس شام کہاں جاتا ہے؟

میں نے کہا کہ شہر میں ایک ہی تو گھر ہے' وہیں جاتا ہے۔"

"وہ کونسا گھر ہے؟"

"کشور ناہید کا گھر۔"

یہ سن کر اس دوست نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ

"اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں"

میں نے اسے بتایا کہ جس شام تم نہیں آتے' اس شام دوستوں پر کیا گزرتی ہے۔ بولا' کیا کروں' مجبوری ہے۔ جب کشور ناہید کا پیغام آجاتا ہے' تو میرا جسم خود بخود اس گھر کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔''

ہاں ایک بات میں غلط کہہ گیا۔ محض کتب بینی ہی اس کا مشغلہ نہیں ہے۔ دو روگ اس نے اور بھی پالے ہیں۔ عشق اور پیچش۔ پیچش کی خاطر وہ دس سال تک مسلسل ایک پیٹنٹ دوا لوموٹل استعمال کرتا رہا۔ میں نے ایک روز پوچھا ''کیا واقعی تمہیں پیچش ہے؟''

''تھی۔ اب نہیں ہے۔''

''کب تھی؟'' ''اب سے دس سال پہلے ہوئی تھی۔ لوموٹل کھائی' پھر نہیں ہوئی۔''

''تو پھر لوموٹل کیوں کھائے چلے جارہے ہو؟''

''پھر بھی تو ہوسکتی ہے' تو لوموٹل کھالیتا ہوں۔ میرا کیا بگڑتا ہے؟''

زاہد ڈار بغیر امراض کے نہیں رہ سکتا۔ جب رفتہ رفتہ اسے یقین ہوگیا کہ پیچش چلی گئی اور اب اس کے آنے کے امکانات نہیں ہیں تو اس نے اپنے لیے اور امراض کا اہتمام کیا۔ ایک آدھ مرض تو اسے شاید واقعی تھا۔ باقی اس نے اپنی نئی طبی تحقیق کی مدد سے دریافت کیے۔ شروع میں تو اس نے انور سجاد کی ڈاکٹری پر بھروسہ کیا تھا مگر انور سجاد سے جب بھی اس نے اپنی جس تکلیف کا بھی ذکر کیا' اس نے ایک ہی نسخہ بتایا کہ خوب پانی پیو' برطانیہ سے آنے والے رسالوں میں میڈیکل رپورٹوں کو پڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تازہ ترین طبی تحقیقوں پر اسے عبور حاصل ہوگیا۔ تب اس نے ایک روز افسوس سے کہا کہ انور سجاد نے یورپ کے نئے تجرباتی ڈراموں کو تو بہت پڑھا' اس سے اسے کیا حاصل ہوا۔ اتنا ہی وقت اگر وہ وہاں کی نئی طبی تحقیقات کے مطالعہ پر صرف کرتا تو اس سے اس کی ڈاکٹری میں بھی تازگی آجاتی اور اس کے مریضوں کا بھی بھلا ہوجاتا۔

زاہد ڈار کی اپنے بارے میں ابتدائی تشخیص یہ تھی کہ اس کے گردے میں پتھری ہے۔ کشور ناہید تک یہ خبر گئی تو اس نے جھٹ اسے ہسپتال میں داخل کرادیا۔ بیمار دیوں کو ہسپتال میں داخل کرانا اس کا ویسے ہی محبوب مشغلہ ہے اور یہ تو زاہد ڈار کا معاملہ تھا۔ وہاں اس کے پیشاب کے ٹیسٹ ہوئے' ایکسرے ہوا' الٹراساؤنڈ ہوا۔ کچھ برآمد نہیں ہوا۔ وہ پھر ٹی ہاؤس آ بیٹھا۔ تھوڑے دنوں بعد اسے اپنی ابتدائی تشخیص کی خامی کا احساس ہوا۔ اب اس کی تشخیص یہ تھی کہ اسے سوزاک ہے۔ کشور نے پھر اسے ہسپتال میں داخل کرادیا۔ پھر سارے ٹیسٹ ہوئے۔ پھر کچھ برآمد نہیں ہوا۔ ہسپتال سے نکل کر پھر ٹی ہاؤس آ بیٹھا۔ اب اس نے اپنی تازہ طبی معلومات کے زور پر یہ تشخیص کیا کہ اسے شوگر ہے مگر جب ٹیسٹ ہوئے تو ان میں کچھ نہیں نکلا۔ اپنے طبی مطالعہ پر اب اسے شک ہونے لگا تھا کہ ''ٹائم'' میں

ایک نئی طبی تحقیق کی رپورٹ اس کی نظر سے گزری۔ اس میں کہا گیا تھا کہ شوگر کی ایک قسم ایسی ہے جس کا کسی ٹیسٹ سے پتہ نہیں چلتا۔ تب اس نے جانا کہ اسے اس قسم کی شوگر ہے جو ہر قسم کے ٹیسٹ کو غچہ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

باقی رہی عشق کی بات تو پہلے میں نے یہ سمجھا تھا کہ شاعری بے شک اس نے نئی کی ہو آخر مغرب کی اتنی ساری نئی شاعری پیئے بیٹھا ہے مگر عاشق وہ میر و غالب کے زمانے کا ہے اور وفاداری بشرط استواری اس کا شیوہ ہے۔ جب اچانک اس کے جسم نے اور ہی طرف حرکت کرنی شروع کر دی تو اسے بھی میں نے اسی روایتی عشق کا شاخسانہ جانا۔ سوچا کہ زاہد ڈار واسوخت لکھ رہا ہے مگر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ خالی واسوخت نہیں۔

مگر اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ زاہد ڈار کو یہ غم بھی تو کھائے جاتا ہے کہ اوزون کا غلاف پھٹ گیا ہے مگر کاروں والوں کو اے سی، فریج، ڈیپ فریزر والوں کو اس کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ اوزون کا غلاف بالکل ہی پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ کم از کم ٹی ہاؤس کی حد تک اس نے روک تھام کی ہے۔ کسی مخیر نے یہ سوچ کر کہ ٹی ہاؤس ادیبوں کا ٹھکانا ہے، وہاں اے سی لگانے کی پیشکش کی تھی۔ زاہد ڈار نے مخالفت کی کہ ایئر کنڈیشنڈ ہونے کے بعد ٹی ہاؤس ٹی ہاؤس نہیں رہے گا۔ اپنی مہم میں وہ کامیاب رہا۔ اے سی کی پیشکش پر شکریئے کے ساتھ معذرت کر لی گئی۔

لیجئے مجھے ایک اور ٹی ہاؤس یاد آ گیا۔ وہ مسز اندرا گاندھی کے اقتدار سے پہلے کا زمانہ تھا۔ میں دلی گیا تو بلراج منیرا نے کہا کہ دلی میں بھی ایک ٹی ہاؤس ہے۔ آؤ ہم تمہیں اپنا ٹی ہاؤس دکھاتے ہیں۔

کناٹ پیلس کے بیچ ایک چائے خانہ، بالکل ٹی ہاؤس۔ وہی نقشہ، اسی قدر آباد۔ ارے یہ تو دیوندر ستیارتھی۔ اپنی سفید ٹیگور ین داڑھی اور سفید لمبی زلفوں کے ساتھ میز پر اپنی پوتھی کھولے بیٹھے ہیں اور یہ کون بزرگ ہیں۔ تعارف ہوا، ہنس راج رہبر۔ دعا سلام کے فوراً بعد نوٹس دیا کہ میں نے دو پمفلٹ لکھے ہیں، انہیں تم جا کر پاکستان والوں کو دکھاؤ گے۔ ایک پمفلٹ میرے ہاتھ میں پکڑایا۔ کہا کہ ''اس میں، میں نے مہاتما گاندھی کو ایکسپوز کیا ہے۔'' پھر دوسرا پمفلٹ پکڑا دیا۔ ''اس میں، میں نے نہرو کو ایکسپوز کیا ہے۔'' پھر تاکید کی کہ بس یہ دونوں پمفلٹ پاکستان والوں کے لیے لے جاؤ۔

میں سٹپٹایا۔ پھر دست بستہ عرض کیا ''رہبر صاحب آپ نے بہت بھاری ذمہ داری میرے سر پر ڈال دی ہے۔ میں اس کا اہل نہیں، معافی چاہتا ہوں۔''

دوسری مرتبہ دلی گیا تو اس دوران اندرا گاندھی آندھی دھاندی آئیں اور ایمرجنسی کا داغ دامن پہ لے کر چلی بھی گئیں۔ میں نے

یاروں سے کہا کہ چلو تمہارے ٹی ہاؤس بھی جھانک لیں۔

''ٹی ہاؤس اب کہاں۔'' منیر نے افسوس سے کہا ''اندرا جی کی ایمرجنسی اسے کھا گئی۔''

میں حیران ہوا۔ ''اچھا' مگر کیوں؟''

''اندرا جی کو شک تھا کہ یہاں بیٹھ کر دانشوران کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ سو وہ عمارت ہی ڈھا دی گئی۔''

میں ہکا بکا کہ اچھا ایمرجنسی میں یوں بھی ہوا۔ پھر تو یہ ایمرجنسی ہمارے مارشل لاؤں سے نمبر لے گئی۔ ایوب خان کے زمانے میں تو لیل و نہار میں ایک اداریہ بھی آ گیا تھا کہ ان ٹی ہاؤ میں بیٹھنے والے دانشوروں کی کیا زبانیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ پھر بھی ٹی ہاؤس چلتا رہا۔

ہاں ان زمانوں میں تو ٹی ہاؤس چلتا رہا مگر اب چلتا رہے تو جانیں۔ چائے خانوں کی تہذیب ہی مٹ گئی۔ چائے خانے گئے۔ چائے خانوں کے ساتھ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والے گئے۔

''اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر''

کہاں نظر آئیں گے۔ پیزا ہٹ میں؟ فاسٹ فوڈ ریستوران میں؟ توبہ کرو۔ اس وقت برما کی عوامی آنگ سان سیو کائی' کی کتاب ''لیٹرز فرام برما'' میرے سامنے کھلی رکھی ہے۔ اس مقام پر جہاں اس نے رنگون کی ٹی شاپس کا ذکر کیا ہے۔ بتا رہی ہے کہ رنگون میں ٹی شاپس کو یا چائے خانوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ ٹی شاپ سٹنگ کا محاورہ چل پڑا ہے۔ ادیب اس سٹنگ کے بہت رسیا ہیں۔ ان کی یہ سٹنگ کبھی ایک غیر رسمی ادبی میٹنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی شعر و شاعری کی محفل بن جاتی ہے۔ طلبہ اور دوسرے نوجوان یہاں آ کر بیٹھتے ہیں اور پوپ میوزک سے لے کر سیاست تک ہر موضوع بکھانتے ہیں۔ آنگ سان سیو کائی کا کہنا ہے کہ رنگون میں ٹی شاپ اور ریستوران کے درمیان ایک خط امتیاز ہے اور یہ خط امتیاز صرف اتنا نہیں ہے کہ ٹی شاپ میں چائے سستی ملتی ہے اور ریستوران میں چائے کی قیمت زیادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر فرق روایت کا ہے۔ ٹی شاپ میں بھٹنے والے طلبہ ان نوجوانوں کے' ان طلبہ اور طالبات کی روایت کے پیرو ہیں جن کی سرگرمیوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے زمانے میں رنگون یونیورسٹی تحریک آزادی کا مرکز بن گئی۔ ریستوران میں بیٹھنے والے نوجوانوں کا مطمع نظر اعلیٰ ملازمت کا حصول ہوتا ہے۔

مبارک ہے رنگون شہر جہاں ٹی شاپ کلچر برقرار ہے اور اس واسطے سے انٹلکچوئل گفتگو کی' سیاسی بحثوں کی' ادبی بحث مباحثہ کی روایت برقرار ہے۔ لاہور شہر کے زوال پر غور کرو کہ یہاں کے ریستورانوں نے اپنی چائے خانے والی روایت کو ختم کر کے سارا زور ڈنر اور لنچ پر دیا اور اپنے آپ کو اونچے ریستوران بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی انٹلکچوئل گفتگو' ادبی بحث مباحثے اور سیاسی تبادلہ خیال کی

روایت جیسے اس شہر سے رخصت ہوگئی ہو۔

ارے کس کس بات کو، کس کس چیز کو یاد کریں
روئے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

کیا کچھ تھا جو اب نہیں ہے۔ پاکستان میں زندگی کس مقام سے شروع ہوئی تھی اور اب کس مقام پر کھڑی ہے۔ ذہنی اور فکری سرگرمی پہلے کتنی تھی' اب کتنی رہ گئی ہے۔ اس کی جگہ فروغ کس چیز نے پایا۔ نعرہ بازی نے۔ فکر سے عاری نعرہ۔ ہم نے اپنے باون برسوں میں یہی کچھ کمایا ہے' گنوایا کیا کیا ہے۔ ارے کیا کروگے پوچھ کر۔ بس اتنا سن لو کہ عید بقرعید پر جب میں نماز پڑھنے مسجد میں جاتا ہوں تو پہرے میں یہ فریضہ ادا کرتا ہوں۔ ہر برس پہرہ پچھلے برس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس برس گیا تو دیکھا کہ ایک مسلح گارڈ مسجد کے باہر تعینات ہے۔ کچھ سپاہی پستول تانے چھت پر مستعد کھڑے ہیں۔ مملکت اسلامیہ پاکستان میں اب سب سے زیادہ غیر محفوظ مقام مسجد ہے۔ کس پاکستان میں ہم نے صبح کی تھی۔ کس پاکستان میں اب شام کرتے ہیں۔

پھر بھی یاروں کی ہمت ہے کہ جوش وخروش سے اکیسویں صدی کے استقبال کی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ جانے اکیسویں صدی ہمارے لیے کیا روکڑ لے کر آ رہی ہے مگر عجب ہوا کہ ہم انتظار کر رہے تھے کہ اکیسوی صدی کی سواری باد بہاری کا مگر اس صدی کی سواری کے پہنچنے سے پہلے چودھویں صدی آن پہنچی اور اب مجھے اپنی نانی اماں یاد آ رہی ہیں۔ کیسی کیسی ہوشربا کہانی ان سے سنی۔ اب کوئی کہانی سالم یاد نہیں۔ ان کہانیوں کے ٹکڑے نوالے حافظہ میں تیرتے رہتے ہیں۔ کسی رات یوں ہوتا کہ کہانی موقوف۔ چودھویں صدی کا قصہ چھیڑ دیتیں۔ بتانے لگتیں کہ اس کمبخت صدی میں کیا کچھ ہوگا۔ آدمی آدمی کو کھائے گا' گائے گوبر کھائے گی' کنواری برما نگے اور عجب بات ہے کہ میری نانی اماں نے چودھویں صدی کے بارے میں جو بتایا تھا' وہی مہابھارت میں کلجگ کے ذیل میں بتایا گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ چودھویں صدی ہے یا کلجگ ہے۔ زمانہ بہرحال کالا پڑتا چلا جا رہا ہے۔ اور سر پہ ایک تلوار لٹک رہی ہے۔ بلکہ محاورے کو چھوڑو اور کہو کہ سروں پہ ایٹم بم گرج رہا ہے۔ جانے کب کس مورکھ کی کل اینٹھ جائے اور یہ دھم سے ہم پہ پھٹ پڑے۔ القارعہ ما القارعۃ۔ اور تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ دھماکہ ہے کیسا۔ تصور کرو اس دن کا جب آدمی ایسے ہو جائیں گے جیسے پتنگے بکھرے پڑے ہوں اور پہاڑوں کی یہ صورت ہو جائے گی جیسے دھنکی ہوئی روئی۔ کمبخت زمانہ تو کالا پڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سفیدی تو بس اب مرغی کے انڈے جتنی باقی رہ گئی ہے۔

◆◆◆

پس نوشت یعنی زیرے کی پڑیا

یادوں کی اس کتاب کی اشاعت نے ایک عجیب صورتحال پیدا کی۔ ایک سوال کا جواب مجھے بار بار دینا پڑا۔ افسانوں کے سلسلہ میں تو میرا موقف یہ چلا آتا ہے کہ جو پوچھنا ہے خود افسانوں سے پوچھو۔ عطر انست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ مگر یہ افسانوں کا نہیں یادوں کا مجموعہ تھا۔

سوال ہر پھر کر وہی ایک ''یہ آپ نے کیسی آپ بیتی لکھی ہے۔ بچپن کا ذکر ہے ہی نہیں نہ اس بستی کا جہاں آپ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ یہ کیسی آپ بیتی ہے۔''

''بھائی یہ آپ بیتی نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہے۔''

''کچھ یادیں ہیں' کچھ باتیں ہیں؟''

اور یادوں کا یہ سفر بھی ایک خاص تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ ان تاریخی لمحوں سے جب گائے سینگ بدل رہی تھی اور میں اس بھونچال میں اپنی بستی چھوڑ کر اس نئے دیس کی طرف گرتا پڑتا چلا آ رہا تھا جس کا نام پاکستان ہے۔ اور اب پاکستان کو بنے ہوئے پچاس برس ہو رہے تھے اور میری ہجرت کو بھی جس کے بیچ میں نے ایک لکھنے والے کی حیثیت سے آنکھ کھولی۔ تو میں نے اس ہنگام اپنے اس نئے جنم کی بھی گولڈن جوبلی منا ڈالی۔ سو اگر یہ آپ بیتی ہے تو بھی آدھی آپ بیتی۔ جسے واقعی آپ بیتی کہنا چاہیے وہ کیسے لکھوں۔ پھر تو مجھے اس بستی میں واپس جانا پڑے گا جو مجھ سے چھوٹ چکی ہے۔ وہ بستی تو اب میرے حسابوں کھوئی ہوئی جنت ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسے یاد کر کے بس کہانیاں ہی لکھی جا سکتی ہیں۔ سو میں نے لکھیں۔ مگر یہ کہانیاں لکھتے ہوئے میں نے اپنی جان کو ایک روگ لگا لیا۔ اچھا میں پہلے یہ بتاتا چلوں کہ جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا تو اس وقت ہماری دنیائے ادب میں ایک بیماری کا بہت چرچا تھا۔ وہ موذی بیماری جس کا نام آتشک ہے۔ آتشک کی بیماری ان دنوں ترقی پسندوں کے لیے زوال پسندی کا استعارہ بنی ہوئی تھی کس حقارت سے وہ بادلیئر کا حوالہ دیتے تھے۔ فرانس کا وہ زوال پسند آتشک زدہ شاعر بادلیئر۔ ترقی پسند محاورے میں یوں سمجھو کہ زوال پسندی اور آتشک نے مل کر جو ایک دوسرے کا ضمیمہ تھے شاعری میں وہ گل کھلایا تھا جسے خود بادلیئر نے بدی کے

پھول کا نام دے رکھا تھا۔

میں اس موذی بیماری کا ذکر ان دنوں بہت سنتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ایک بیماری میرے اندر بھی پل رہی ہے۔ اس بیماری کی تشخیص بھی میرے ترقی پسند دوستوں ہی نے کی اور ترحم اور تحقیر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دنیائے ادب کو بتایا کہ یہ شخص نوسٹلجیا کا مریض ہے۔ آتشک کو اس وقت کی ہماری دنیائے ادب نے بادلیئر کے واسطے سے جانا تھا' نوسٹلجیا کی بیماری کو اس حقیر بیمار کے واسطے سے جانا۔ میں بادلیئر سے برابری کا دعوی کرنے کی جرات تو نہیں کر سکتا مگر اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ نوسٹلجیا بھی کوئی معمولی بیماری نہیں ہے۔ بادلیئر کا مقام و مرتبہ برحق' مگر میری زوال پسندی بھی کوئی ایسی غیر وقیع نہیں ہے۔

شاید یہ میری نوسٹلجیائی ذہنیت کا کرشمہ ہے کہ اب مجھے پاکستان کا ابتدائی زمانہ پاکستان کی ادبی تاریخ کا سنہری دور نظر آتا ہے۔ کیا خوب زمانہ تھا کہ تخلیقی جوش بھی نظر آتا تھا اور نظریاتی لڑائیاں بھی ہو رہی تھیں۔ یعنی ابھی عسکری صاحب نے ادبی جمود کا اعلان کیا تھا نہ ادب کی موت کی خبر بد سنائی تھی۔ وہ وقت ابھی دور تھا۔ ابھی تو گھروں سے نکلنے اور جانوں کے جانے کا غم تازہ تازہ تھا۔ دل گداز تھے۔ بات دل سے نکلتی تھی اور فوراً ہی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ منٹو صاحب نے لاہور میں بیٹھ کر پہلا ہی افسانہ لکھا تھا کہ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تحریر کی ہنگامہ آرائی اپنی جگہ ویسے بھی منٹو صاحب جس محفل میں جاتے کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور اٹھ کھڑا ہوتا۔ لیجئے مجھے حلقہ کی وہ نشست یاد آ گئی جہاں منٹو صاحب لاہور آنے کے بعد شاید پہلی مرتبہ شریک ہوئے تھے۔ وہ داستان سنا رہے تھے جب اپنے خلاف مقدمہ کی پیشی بھگتانے کے لیے وہ اور عصمت دونوں لاہور آئے تھے۔ سنانے لگے کہ پیشی بھگتانے کے بعد ہم دونوں انارکلی بازار گئے۔ عصمت چغتائی نے اپنے لیے جوتی خریدی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے برجستہ پوچھا ''منٹو صاحب' جوتی کس نمبر کی تھی۔''

بس منٹو صاحب بکھر گئے۔

اصل میں مزاج میں گرمی بہت تھی۔ پارہ جلدی چڑھ جاتا تھا۔ مزاج کے خلاف ذرا کوئی بات ہوئی اور مزاج میں درہمی آئی۔ اسی لیے ان کے افسانے پر یار لوگ بات ذرا سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ مگر محفل میں سب مزاج آشنا تھی تو نہیں ہوتے تھے۔ حلقہ ہی کے ایک جلسہ میں ایک ناعاقبت اندیش نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی برتی اور افسانے پر کڑی تنقید کر ڈالی۔

منٹو صاحب نے برہمی سے معترض کو دیکھا ''برادر' تمہارا نام کیا ہے۔''

''انور شبنم دل۔''

''انور، شبنم، دل'' منٹو صاحب نے رک رک کر کہا۔ پھر بولے ''یعنی اکٹھے تین ناول۔ پہلے فیصلہ کرو کہ تم انور ہو یا شبنم ہو یا دل ہو، پھر افسانے پر بات کرنا۔''

''نقوش'' نے اردو افسانے پر ایک بحث کا اہتمام کیا۔ شہر میں موجود کیسا کیسا نامور افسانہ نگار اور نقاد باغ جناح کے ایک سبزہ زار میں چائے کی لمبی میز کے گرد جمع تھا اور افسانے پر گوہر افشانی کر رہا تھا۔ منٹو صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے افسانے زیر بحث آئے۔ سب ہی نے باری باری اظہار رائے کیا اور ان کے افسانے میں کیسی کیسی باریکیاں اور خوبیاں دریافت کیں۔ منٹو صاحب بہت دیر سے بیٹھے تھے۔ اپنے بارے میں ہمعصروں کی رائے سن کر مطمئن ہوئے اور بیچ میں سے اٹھ کر چلے گئے۔ بس ان کے جاتے ہی ہوا کا رخ بدل گیا۔ کسی ایک نے ان کے افسانوں میں کسی خامی کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا۔ کسی دوسرے نے بات کو لپکا اور ڈیڑھ دو اور خامیاں گنا ڈالیں، بس پھر جھجک نکل گئی اور منٹو صاحب پر بے تکلف تنقید ہونے لگی۔

حلقہ کے حوالے سے عسکری صاحب کی سن لو۔ ویسے تو حلقہ کی نشستوں میں آتے نہیں تھے۔ مگر تین نشستوں میں ضرور شامل ہوئے۔ دو نشستوں میں اس طرح کہ اپنے دو مقالے پڑھے۔ تیسرے جلسہ میں صدارت کی تقریب سے شریک ہوئے۔ پوری زندگی میں یہ شاید ان کی پہلی اور آخری صدارت تھی۔ اور کیا خوب صدارت کی کہ حلقہ کی ساری روایت ہی کو ملیامیٹ کر دیا۔ حلقہ میں کوئی تحریر پڑھی جائے اور لکھنے والا داد بیداد سے محروم گذر جائے' یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر یہاں بحث کے کچھ آداب تھے۔ جب مقالہ یا افسانہ ختم ہو جاتا تو صدر بحث کی دعوت دے کر تھوڑا انتظار کرتا۔ اور جب کوئی شروعات نہ کرتا تو حلقہ کے جو اوپننگ بیٹسمین تھے ان سے کسی ایک کو بطور خاص مخاطب کر کے اظہار خیال کی دعوت دی جاتی۔ تب وہ جھرجھری لیتا اور اس جھرجھری کے ساتھ بحث کرنے والوں میں گرمی پیدا ہوتی اور بحث گرمی پکڑتی چلی جاتی۔ مگر عسکری صاحب نے کیا کیا۔ جب مقالہ ختم ہوا تو روکھے سے لہجہ میں کہا ''کسی صاحب کو اس مقالہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔''

ذرا سے وقفہ کے بعد کہا کہ ''اچھا تو کسی کو اس مقالہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔'' اور اس کے ساتھ ہی جلسہ کے ختم کا اعلان کر دیا۔ حلقہ والے ہکا بکا کہ یہ کیا ہوا۔ عسکری صاحب تو صدارت کا طوق گلے سے اتار کر فوراً ہی نکل گئے مگر ان کے جانے کے بعد چائے کی میز پر ان کے خلاف کتنا زہر اگلا گیا۔

عسکری صاحب اکل کھرے آدمی۔ محفلوں سے بدکتے تھے۔ صدارت تو دور کی بات ہے۔ مضمون پڑھنے کے بھی کم کم ہی روادار ہوتے تھے۔ لاہور میں رہتے ہوئے دو مرتبہ آ کر مضمون پڑھا۔ تیسری مرتبہ جب کراچی سے آئے ہوئے تھے تو امجد حسین

نے کہا کہ اس وقت حلقہ کے سیکرٹری تھے انہیں گھیرا۔ وہ آئے مگر دہلیز تک۔ وہیں سے پلٹ گئے۔ جلسہ اوپر والی ایم سی اے کے بورڈ روم میں ہو رہا تھا۔ نیچے بلیک بورڈ پر پروگرام لکھا دیکھا۔

صدر الطاف گوہر

مقالہ محمد حسن عسکری

''اچھا تو الطاف گوہر کی صدارت ہے۔'' یہ کہتے کہتے پلٹے۔ سامنے ایک تانگہ گزرتا نظر آیا۔ اسے روکا اس لپک کر بیٹھے۔ ساتھ میں سعید محمود کو بھی بٹھالیا۔ اور یہ جا وہ جا۔ میں نے اوپر جا کر امجد حسین کے کان میں کہا کہ تمہارا مہمان تمہیں دغا دے گیا۔

یوم الجزائر کے جلسہ میں جو ادیبوں کی طرف سے ہوا وہ آئے ضرور۔ مضمون بھی لکھا۔ لکھنا ہی تھا' اس جلسہ کے تو وہ محرکین میں سے تھے۔ مگر مضمون پڑھا کسی دوسرے نے۔ خود کیسے پڑھتے۔ اس کے لیے تو سٹیج پر جا کر مائیک کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا۔ ایسا واقعہ تو انہوں نے زندگی بھر اپنے ساتھ گزرنے ہی نہیں دیا۔ عسکری صاحب بس قلم کاغذ کے مرد میدان تھے۔ جلسے جلوس سے بھاگتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ جلسہ جلوس کے قائل نہ ہوں۔ بہت قائل تھے جبھی تو الجزائر کی جدوجہد کے سلسلہ میں صرف مضامین لکھنے پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ''لیل ونہار'' میں لکھتے لکھتے ادیبوں کی طرف سے یوم الجزائر منانے کے منصوبے میں سبط صاحب کے شریک بن گئے۔ پیش پیش رہے۔ سب میٹنگوں میں شریک رہے۔ مگر جب جلسہ کا وقت آیا تو پچھلی صفوں میں جا کر چھپ گئے۔ سٹیج پر آ کر گھن گھرج سے بولنا' نعرے لگانا یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تحریر میں بیشک نعرہ لگوالو۔ آخر انہوں نے پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا ہی تھا۔ پاکستانی ادب کا نعرہ۔ پھر اسلامی ادب کا نعرہ۔ مگر نعرے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ عسکری صاحب پورے نہیں کر سکتے تھے۔ جن میں یہ صلاحیت تھی انہوں نے ان نعروں کو اچک لیا اور پھر ان نعروں کی اپنے رنگ سے تعبیر کی۔

لیجئے یہاں مجھے الل ٹپ ڈاکٹر سید عبداللہ یاد آ گئے۔ خوب بزرگ تھے۔ ایک نعرہ ان کے پاس بھی تھا۔ اردو کا نعرہ۔ ان کی تحقیق اور تنقید اپنی جگہ۔ مگر انہوں نے نعرہ لگانے کا بھی حق خوب ادا کیا۔ بیان بازی بھی کی۔ جلسے بھی کئے' جلوس بھی نکالے اور اردو کے نام پر کیسے کیسے ثقہ بزرگ کو سڑکوں پر لے آئے۔ جب دکانوں کے سائن بورڈ اردو میں لکھنے کی تحریک شروع کی تو پروفیسر حمید احمد خاں ان کے ساتھ تھے۔ ایک ایک دکاندار کے پاس گئے اور اسے قائل کیا کہ برادر اپنا سائن بورڈ اردو میں لکھو۔

سید صاحب نے جب دیکھا کہ حکومت تو ٹس سے مس ہی نہیں ہوتی۔ بیان جاری کرو' جلسہ کرو' جلوس نکالو' وہاں کانوں پر جوں ہی نہیں رینگتی اور اردو کے سرکاری زبان بننے کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ تب انہوں نے ایک نرالا منصوبہ بنایا۔ اردو کے حق میں

دستخطوں کے ایک میل لمبے جلوس کا منصوبہ۔ اس طرح کہ ایک محضر نامہ تیار کیا جائے دستخطوں سے لبریز اتنا لمبا کہ ایک میل کی خبر لائے۔ اندازلگایا کہ ایک میل لمبے محضر نامے کے لیے کتنے دستخط درکار ہوں گے اور حساب کر کے طے کیا کہ پچاس لاکھ دستخطوں کی ضرورت پڑے گی۔

ایک تن جلے نے کہا کہ سید صاحب پچاس لاکھ دستخط تو جمع کر لیں گے مگر ان دستخطوں کے لیے ایک میل لمبا کاغذ کہاں سے لائیں گے۔ یعنی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا جی ناچیں گی اور واقعی رادھا جی نہیں ناچیں۔

مگر ایک جلسہ میں عجب ہوا۔ پاکستان نیشنل سنٹر میں جلسہ ہو رہا تھا۔ سید صاحب تقریر کر رہے تھے۔ یعنی اپنے محبوب موضوع اردو کے مسئلہ پر بول رہے تھے۔ سامعین میں سے اچانک ایک شخص کھڑا ہوا اور تیز تیز بولنا شروع کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ہاں اس کا یہ اعلان صاف اور واضح تھا کہ اصلی مجاہد اردو میں ہوں۔ میں اردو کی حیثیت کو حکومت اور قوم سے منواؤں گا۔ سید صاحب حیران کہ یہ مجاہد اردو کس کھوہ سے برآمد ہوا ہے۔ مگر مجاہد اردو برآمد ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ مجاہد اردو لکھنا شروع کر دیا اور سر پر ایک ٹوپی منڈھ لی جس پر چاند تارا بنا ہوا تھا۔ اور پھر شہر میں ہونے والے ہر جلسہ میں نظر آنے لگا۔ خاص طور پر جہاں سید صاحب کو خطاب کرنا ہوتا۔ اسی طرح تقریر کے بیچ کھڑے ہو کر اردو پر پوری تقریر کر ڈالتا اور جلسہ میں کھنڈت ڈال دیتا۔ سید صاحب نے اردو کے لیے بہت مجادلے کئے تھے اور ہر مجادلے میں سرخرو ہوئے تھے۔ مگر اب حیران تھے کہ اس مجاہد اردو سے کیسے نبٹیں۔

لیجئے اس پر مجھے ایک اور مجاہد اردو یاد آ گیا۔ اسی شہر میں ساٹھ کی دہائی میں نمودار ہوا تھا۔ اس کی مار اردو بازار سے ٹی ہاؤس تک تھی۔ اصلی نام تو کچھ اور تھا۔ مگر اب اس نے اپنی مہم کے حساب سے اپنا نام رکھا تھا' الف المحراث۔ کوئی پوچھتا کہ الف المحراث کا مطلب کیا ہے۔ جواب دیتے کہ ہل کا پھل۔

الف المحراث کا موقف یہ تھا کہ اردو کے سارے محاورے' سارا روزمرہ غلط ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مصلح وہ خود تھے۔ کہتے تھے کہ بلی دودھ پی رہی ہے' یہ کیا بات ہوئی۔ غلط زبان ہے۔ کہنا یوں چاہیے کہ بلی دودھ لبڑ رہی ہے۔ شاخ سے آم توڑا۔ غلط بالکل غلط۔ آم شاخ سے توڑا نہیں جاتا' چونٹا جاتا ہے۔ سنگریزہ غلط ہے۔ اصلی لفظ ہے چھن۔ اور سراب۔ یہ سراب کیا ہوا۔ اس کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اصلی لفظ ہے ہرن پیاس۔

الف المحراث خالی باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایک تہلکہ خیز تصنیف کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ اس کا نام تھا۔ اردو حریفہ مکالے۔

اس میں لفظوں اور محاروں کی اسی رنگ سے تصحیح کی گئی تھی۔ عجب تو اردو ہوا۔ انہیں دنوں افتخار جالب نے نئی لسانی تشکیلات کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اور اس سے متاثر ہو کر ظفر اقبال نے اردو محاوروں اور لفظوں کو توڑ پھوڑ کر نئے نئے لفظ نئی نئی ترکیبیں گھڑی تھیں اور اپنی غزل میں کھپائی تھیں۔ یاروں کے لیے یہ نئی اردو تفنن طبع کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اسی ہنگام الف الحراث اپنی تصنیف لطیف 'اردو حریفہ مکالے' کے ساتھ نمودار ہو گئے۔ میں نے ایک کالم لکھ ڈالا کہ لیجئے اب پتہ چلا کہ نئی لسانی تشکیلات کی تحریک کہاں سے پھوٹی ہے۔ اس کا ماخذ تو 'اردو حریفہ مکالے' ہے۔ یعنی الف الحراث نئی لسانی تشکیلات کے مرد اول ہیں۔

اس کالم پر سب سے زیادہ غصہ الف الحراث کو آیا۔ مجھ سے آ کے لڑنے لگے۔ کہنے لگے کہ مرد تو مجھے قدرت نے بنایا ہے۔ مرد اول کہہ دینے سے تو میرے مقام و مرتبہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میں نے کہا پھر آپ کو کس لقب سے یاد کریں۔ بولے کہ ''آپ ہمیں عاہل نثرہ الف الحراث کے لقب سے یاد کیجئے۔''

میں نے کہا کہ بہت مشکل اردو ہے۔ اسے تھوڑا سا آسان بنایئے۔

کہا کہ ''اچھا یوں کہئے شہنشاہ نثر الف الحراث۔''

پھر میں نے پوچھا کہ ''آپ کی نئی کتاب کب آئے گی۔''

کہا کہ ''بس آنے والی ہے۔ اس کا نام ہے خاطر غبار۔''

میں نے کہا کہ ''یہ نام تو آپ کی اپنی اردو میں نہیں ہے۔''

بولے ''یہ مت کہئے۔ یہ نام بہت جلیہ ہے۔''

''جلیہ کا کیا مطلب ہے۔''

بولے ''مطلب یہ ہے کہ بہت کشش ناک ہے۔'' پھر وضاحت کی کہ ''مولانا ابوالکلام آزاد نے تو اپنی ''غبار خاطر'' میں ساری اردو ہی غلط لکھی ہے۔ میں نے اس کتاب میں اس کی بال پہاڑن کی ہے۔''

''بال پہاڑن' آپ کا مطلب ہے کہ تنقید کی ہے۔''

''تنقید'' تحقیر آمیز انداز میں مسکرائے ''غلط اردو۔ صحیح اردو ہے باپہاڑن۔''

''بال پہاڑن آپ نے کس طرح کی ہے۔'' میں نے پوچھا۔ بولے ''بتاتا ہوں۔ مولانا نے لکھا ہے' چاند بی بی کی قبر۔ یہ تو جھونپڑے والی اردو ہے۔ بالکل غیر ادبی۔''

''پھر ادبی اردو میں چاند بی بی کی قبر کو کیا کہیں گے۔''

جواب دیا ''جدث لبوہ جلوب۔''

بس میں نے الف الحراث کے ہاتھ چوم لئے۔ ''سبحان اللہ۔ نئی لسانی تشکیلات کے اصلی موجد آپ ہیں۔ باقی یہ سب لونڈے آپ کے خوشہ چین ہیں۔''

الف الحراث کا ایک طریقہ اصلاح زبان یہ تھا کہ اگر محارہ ہندی آمیز ہے تو اسے مفرس معرب کر دیتے تھے۔ معرب مفرس ہوا تو اسے نامانوس سا ہندی رنگ دے دیا۔ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ

''کہوار دو کو چت کر دیں کہوار دو کو پٹ کر دیں''

تو اس بزرگ کا طریقہ واردات یہ تھا کہ اردو چت ہے تو اسے پٹ کر دو۔ پٹ ہے تو چت کر دو۔

اصل میں یہ تو سودے کی بات ہے۔ اردو کی تھوڑا ہی ابدی ہے۔ سر میں جو بھی سودا سما جائے۔ لیجئے اس پہ مجھے عثمان علی خاں یاد آ گئے۔ خاندانی آدمی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تھے۔ مگر اس خاندان کے بزرگوں میں ایک بات دیکھی کہ ہر ایک کی اپنی ایک لٹک۔ سر میں کوئی نہ کوئی سودا سمایا ہوا۔ کوئی اردو کا سودائی۔ کوئی غالب کا متوالا۔ کوئی تحریک خلافت کا کشتہ۔ تو عثمان علی خاں کی بھی اپنی ایک چیٹک تھی۔ میری ان سے مڈھ بھیڑ بس میں ہوئی تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور پاکستان ٹائمز کے انتظامی شعبہ سے منسلک تھے۔ روز صبح کو بس سے دفتر جاتے تھے۔ انہیں اوقات میں میں نہر کے پل سے اس بس میں سوار ہوتا تھا۔ بالعموم وہ ڈبل ڈیکر ہوتی تھی۔ میں بالائی منزل میں جاتا تو دیکھتا کہ اگلی نشست پر عثمان علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی ہے۔ اس پر گتے کا ایک کتبہ نصب ہے۔ اس عبارت کے ساتھ

مسلمانو! میرا نصب العین ہے

خلیفہ کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنا

گم سم بیٹھے رہتے۔ مگر اچھرے سے آگے گزر کر جب بس کی یہ بالائی منزل کچھا کھچ بھر جاتی تو وہ جھرجھری لے کر اچانک کھڑے ہو جاتے۔ مسافروں کو مخاطب کرتے ''اے میرے مسلمان بھائیو! میرا اعلان آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ مگر آپ اخباروں کو جانتے ہی ہیں کہ ان کا کیا حال ہے۔ اس اتوار کو ایک اخبار نے میرا اعلان ضرورت رشتہ کے اشتہار کے نیچے چھاپ دیا۔ خیر میں نے اب سے اشتہار کی صورت میں چھپوا لیا ہے۔ جسے درکار ہو مجھ سے لے لے۔ اے میرے مسلمان بھائیو! میں کب سے

جمعہ کی نماز کو ترس رہا ہوں۔ نہیں پڑھ سکتا۔ جمعہ کی نماز تو خلیفہ کے پیچھے پڑھی جاتی تھی۔ خلیفہ کہاں ہے۔ پاکستان بن گیا۔ مگر میں ہنوز جمعہ کی نماز کو ترس رہا ہوں کیونکہ میرا نصب العین ہے خلیفہ کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنا۔''

تقریر کر کے بیٹھ جاتے اور بیگ سے اشتہار نکال کر آس پاس بیٹھی ہوئی سواریوں کے ہاتھوں میں تھمانے لگتے۔ کوئی کوئی دور سے اٹھ کر آتا اور خود ہی وہ اشتہار لے لیتا۔ میری ان سے علیک سلیک ہوتی۔ مگر میں ان کے دست مبارک سے یہ اشتہار حاصل کرنے کا شرف کبھی حاصل نہ کر سکا۔ میں تو اپنے دفتر جانے کے لیے ریگل کے بس سٹاپ اتر جاتا۔ اس وقت تک وہ مشتاقان اشتہار کے بیچ گھر چکے ہوتے۔

اورینٹل کالج میں ایک پروفیسر صاحب تھے۔ اب بھی ہیں۔ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ پروفیسر عبیداللہ۔ یوم اقبال کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مغرب کا وقت آ گیا۔ مگر مقرر تھے کہ تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے بیچ میں کھڑے ہو کر با آواز بلند اذان دینی شروع کر دی۔ قریب کی نشست سے ایک آواز آئی

''مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ''

ارے میں جلسوں کا ذکر کئے جا رہا ہوں' جلسہ گاہوں کو فراموش کر رہا ہوں۔ منڈوا نہ ہو تو تھیٹر کہاں ہو گا۔ کیا مضائقہ ہے کہ تھوڑا ذکر جلسہ گاہوں کا بھی ہو جائے۔ اصل میں جلسوں میں میرا زیادہ آنا جانا کالم نگاری کے حوالے سے تھا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب میں نے ''مشرق'' میں لاہور نامہ' کے عنوان سے کالم شروع کیا۔ یہ ایوب خاں کا زمانہ تھا۔ ایوب خاں کے فیض سے لاہور میں دو جلسہ گاہیں وجود میں آئیں اور دونوں نے اس زمانے میں بہت رونق پکڑی۔ اسی زمانے میں پاکستان کونسل قائم ہوئی تھی۔ اس کی پہلی ڈائریکٹر فرخ نگار عزیز تھیں۔ الفلاح کی دوسری منزل میں کونسل کا دفتر بنا اور ساتھ میں جلسوں کے لیے ایک ہال۔ ان کے بعد قیوم نظر یہاں ڈائریکٹر ہوئے۔ وہ حلقہ ارباب ذوق والا اپنا تجربہ اپنے ساتھ لائے اور اچھے جلسے کرائے۔ ان کے بعد کشور ناہید اس ادارے میں رونق افروز ہوئیں اور اس کے جلسوں میں رونق پیدا کی۔ دوسری جلسہ گاہ اس زمانے میں بی این آر کے نام سے وجود میں آئی۔ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن عہد ایوبی میں نمودار ہوا۔ اس کے زیر اہتمام ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے بیچ بی این آر آڈیٹوریم نے نمود کی۔ ایوب خاں کے زمانے تک یہاں بہت چہل پہل رہی۔ کتنے بزرگوں اور شہر کے نامور مقرروں مورخوں محققوں کو میں نے یہیں سے جانا۔ اے لو مجھے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی یاد آ گئے۔ کیا خوب بزرگ تھے اور کیا کمال کے تھے۔ بی این آر آڈیٹوریم میں سر عبدالقادر کی یاد میں جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے مقالہ پڑھا اور عجب سوال اٹھایا۔ ایک شخصیت کا ذکر کیا کہ اس نے سر شیخ

عبدالقادر اور علامہ اقبال دونوں کو دعوت پر بلایا۔ جب کھانا پینا ہو چکا اور دستر خوان لپٹ چکا تو اس نے علامہ سے پوچھا کہ گستاخی معاف کیا آپ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے سوال کیا کہ آخر وہ کون شخص تھا۔ اس کا نام و پتہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اسی سوال کی راہ تو علامہ کی شاعری میں وہ موڑ آیا کہ وہ اردو سے فارسی شعر کی طرف راغب ہو گئے۔

پھر انہوں نے ایک اور دعوت کا ذکر کیا جو خود علامہ اقبال نے کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ جب علامہ سید سلیمان ندوی اس شہر میں وارد ہوئے تو علامہ نے اپنے یہاں ان کی دعوت کی۔

اب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے سامعین کے بیچ بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری لی اور لپک کر سٹیج پر آئے۔ کہا کہ آگے کی بات میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آگے کی بات انہوں نے اس طرح بتائی کہ وہ باورچی کون تھا جس نے کھانا پکایا تھا اور اس شام اس نے کون کونسے کھانے تیار کیے تھے۔ کس تفصیل سے انہوں نے باورچی کا ذکر کیا۔ معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں تحقیقات پر جتنی توجہ صرف کی ہے اتنی ہی اس باورچی کے بارے میں بھی تحقیقات پر دھیان دیا ہے۔ پھر انہوں نے وہ کھانے گنانے شروع کیے جو اس نے کمال ہنر سے اس شام تیار کیے اور دستر خوان پر سجائے۔

باورچی کا نام انہوں نے نہیں بتایا۔ بس ان کی تحقیق میں یہی ایک کھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر جس پہلوان نے علامہ کو اکھاڑے میں زور کرائے تھے اس کا نام انہیں خوب یاد تھا۔ کسی دوسرے موقع پر اسی ایوان میں انہوں نے علامہ اقبال کی پہلوانی کا ذکر کیا۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے اس پہلوان کو ڈھونڈ نکالا اور بتایا کہ اس کا نام لاٹو تھا۔ اقبال اور آغا باقر اس کے بچپن کے دوست تھے۔ دونوں کو اس نے اپنی شاگردی میں لے کر زور کرانے شروع کر دیئے۔ سو برسوں علامہ لنگر لنگوٹ باندھ کر لاٹو کے اکھاڑے میں زور کرتے رہے' کشتی لڑتے رہے۔

مگر اقبالیات والوں نے ان کی اقبالیاتی تحقیق کی قدر نہیں کی اور ایک سوال انہوں نے ایسا اٹھایا تھا کہ شہر کے مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے تھا مگر نہیں دیا۔ یہ لڑائی انہوں نے اکیلے ہی لڑی۔ جب مسجد شہداء تعمیر ہو رہی تھی تو انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ مسجدوں کا جو روایتی طرز تعمیر ہے یہ اس سے انحراف ہے۔ اس مسئلہ کو وہ عدالت تک لے گئے۔ مگر بیچاروں نے اکیلے ہی یہ لڑائی لڑی۔ اکیلا آدمی کتنا لڑ سکتا ہے۔ بیچارے ہار گئے۔ اور مسجد شہداء اپنے اکیلے مینار کے ساتھ بخیر و خوبی کھڑی ہو گئی۔

اور ہاں اپنے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید جنہیں میں نے بی این آر میں بھی بہت سنا اور پاکستان کونسل میں بھی۔ کیا وضعدار آدمی

تھے۔ نپا تلا لباس پہنتے تھے' نپا تلا مضمون لکھتے تھے۔ گرمی جاڑا برسات جو بھی موسم ہو اور جو بھی پہر ہو بیشک جون کی کھڑی دوپہر ہی ہو وہ سوٹ میں ملبوس نظر آتے۔ مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالمجید بھٹی کے بعد وہ اس شہر کی تیسری شخصیت تھے جنہوں نے سوٹ کو ایسی وضعداری کے ساتھ نبھایا کہ جون جولائی کی گرمی بھی اس کے سامنے بے اثر نظر آئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کسی نہ کسی سے ٹھنی ہی رہتی تھی۔ ایک زمانے میں ان کی مرغوب صدیقی سے بہت چلی ہوئی تھی۔ مرغوب صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے تو انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی سے دشمنی مول لے لی۔

ادھر ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ہمیشہ بگڑے رہتے تھے۔ حفیظ صاحب جواب میں کہتے کہ یہ میرا نالائق بھتیجا ہے۔ میں اسے کیا کہوں اور پھر خوب کہتے بھی تھے۔ میں نے حفیظ صاحب سے ایک گفتگو کی اور اسے اپنے کالم میں شائع کر دیا۔ عبدالسلام خورشید کو ایسا موقع خدا دے۔ فوراً خط لکھا۔

''آپ نے اپنے والہ وشیدا حفیظ جالندھری پر جو کچھ لکھا تشنگی سے عبارت ہے۔ ہم نے مانا فیض شاعر نہیں ہے' جگر سوچتا نہیں ہے۔ یگانہ انانیت کی وجہ سے اقلیم شعر سے نکالا گیا۔ رہا جوش تو حفیظ فرماتے ہیں کہ ''اگر وزن میں لکھنے والے کو شاعر کہتے ہیں تو وہ شاعر ہے۔'' تعجب کی بات ہے کہ آپ نے اقبال کے بارے میں نہ پوچھا۔''

ادھر حفیظ صاحب نے میری خبر لی۔

''میاں صاحبزادے تم نے میری گفتگو کا وہ حصہ قلمبند نہیں کیا جو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید و نیز فیض احمد فیض سے متعلق تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہ جوش کو واقعی میں قافیہ ردیف کے لحاظ سے کسی بات کو نظم کر دینے والا مانتا ہوں اور لغات الفاظ جانتا ہوں' شاعر نہیں۔''

چچا بھتیجے کی لڑائی سے قطع نظر میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا ایک لحاظ سے بہت قائل تھا۔ طول کلام کے بالکل قائل نہیں تھے۔ ناپ تول کر لکھتے تھے۔ جو مضمون جلسہ کے لیے لکھ کر لاتے نو منٹ کا ہوتا۔ نہ ایک سیکنڈ کم نہ ایک سیکنڈ زیادہ۔ پھر جلسوں کے رنگ کو دیکھ کر طے کیا کہ نو منٹ زیادہ ہیں۔ مضمون سات منٹ کا ہونا چاہیے۔ جلسہ کے مقرروں' مقالہ نگاروں میں ایجاز اور اختصار کا قائل میں نے صرف انہیں کو دیکھا۔ مجھ پہ مہربان ہوئے تو مجھے بٹھا کر نصیحت کی کہ اگر دل کی بیماری سے بچنا چاہتے ہو تو انڈے اور مکھن کو بالکل بھول جاؤ۔ گرم مصالحوں اور چکنی چیزوں سے پرہیز کرو۔ اپنا وزن بڑھنے مت دو۔ صبح کی سیر کو اپنی عادت بنالو۔

میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ سارے پرہیز آپ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ موٹاپے سے بھی آپ کوسوں دور ہیں۔ مگر دل کی بیماری تو پھر بھی آپ کو لگ گئی۔ اس بات کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

خوش آ گئی ہے ضیا کو جالندھری میری
وگرنہ شعر مرے کیا ہیں شاعری کیا ہے

یہ شعر خوب چلا۔ شاید حفیظ صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ ضیا الدین جالندھری کی طرف دیکھ کر بے ساختہ بولے۔ ''ایک میں جالندھری ہوں جس کے گال پچکے ہوئے ہیں اور رنگ کالا پڑ گیا ہے۔ ایک یہ جالندھری ہے جس کے گال بھرے ہوئے ہیں اور رنگ سرخ و سفید ہے۔''

یہ کرنل صدیق سالک کی کتاب ''Witness to Surrender'' کی افتتاحی تقریب بھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صدارت کر رہے تھے۔ ایس ایم ظفر مقررین میں شامل تھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں نے جلدی جلدی یہ کتاب پڑھی اور یہاں حاضر ہو گیا۔ جاوید اقبال نے تعجب بھرا نکرا لگایا' اچھا' کتاب پڑھ لی۔ پاکستان کے لیڈر حضرات تو کتاب پڑھنے کے سرے سے قائل نہیں ہیں۔''

اچھا حفیظ صاحب اگر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو بھتیجا بتاتے تھے تو مولانا عبدالمجید سالک کے ہمعصر اور رفیق ہونے کے ناتے سے کہتے تھے کہ سالک صاحب سے تو مجھے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا مگر ان کی وجہ سے مجھ پر ایک چوری کا الزام ضرور لگا تھا۔ دیکھئے پھر مجھے م' حسن لطیفی یاد آ گئے۔ کیا کمال کے آدمی اور کیا کمال کے شاعر تھے۔ پستش بغایت پست۔ بلندش نہایت بلند:

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا

ان کی دلچسپ شخصیت نے مجھے ایک مرتبہ گدگدایا تو میں نے ایک کالم لکھ ڈالا۔ بس ناراض ہو گئے اور ایسے ویسے ناراض۔ اس وقت آفاق کے مینجنگ ایڈیٹر میر نور احمد تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا کہ م' حسن لطیفی کے بارے میں آپ نے کیا لکھ دیا ہے۔ وہ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا مکتوب گرامی میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ لکھا تھا کہ یہ جو آپ کے دفتر میں ایک شخص انتظار حسین کام کرتا ہے۔ یہ اصل میں عبدالمجید سالک کا گماشتہ ہے۔ اس کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ عبدالمجید سالک میرا دشمن ہے۔ اس کے کہنے پر اس نے میرا دماغ چرا لیا ہے۔

شام پڑے میں ٹی ہاؤس گیا تو ناصر کاظمی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا ''تم نے لطیفی صاحب کو ناراض کر دیا۔'' پھر جب لطیفی صاحب آئے تو ناصر نے ان کے سامنے میری پیشی کرائی۔ میں نے معافی مانگی اور ناصر نے انہیں منا کر مجھے معافی دلوائی۔

ویسے تو ڈاکٹر سید عبداللہ بھی کئی بار مجھ سے ناراض ہوئے۔ مگر انہیں خوش کرنے کا نسخہ میرے پاس تھا۔ اردو کے حق میں ان کے

بیان یا ان کی تقریر کی تھوڑی تعریف کر دی تو بس خوش ہو گئے مگر اردو کے سوا بھی تو ان کی کچھ پریشانیاں تھیں۔ یوں سمجھو کہ ان کی بڑی پریشانیاں دو تھیں اردو اور نیچی نظر کی تہذیب۔ ان کی اس دوسری پریشانی میں ان سے ہمدردی جتانا ذرا مشکل تھا۔ اصل میں وہ زمانہ گزر گیا تھا جب اورینٹل کالج میں وہ پرنسپل تھے اور طالبات برقعوں میں لپٹی لپٹائی نظر آتی تھیں۔ اب وہ جس جلسہ میں جاتے دیکھتے کہ بیبیاں لڑکیاں بالیاں کھلے سر منہ طباق سا لئے بیٹھی ہیں اور وہ اپنی تقریر میں بتاتے کہ پاکستان کا معاشرہ اصل میں پردہ دار معاشرہ ہے اور اس کی تہذیب نیچی نظر کی تہذیب ہے۔ مگر یہاں تو لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ڈھلتا چلا جا رہا تھا اور دوپٹے مختصر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

پھر جب امرتسر میں بوسٹر لگا اور ہندوستان کے ٹی وی پروگرام پاکستان میں نظر آنے لگے تو انہوں نے سخت احتجاج کیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر ثقافتی حملہ کر دیا ہے۔

بہر حال خوب زمانہ تھا اور خوب لوگ تھے۔ ہر بزرگ کی اپنی ایک لنک تھی۔ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ اس کے بعد تو محفلوں میں درہمی آتی چلی گئی اور جلسوں کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ جن ایوانوں میں یہ جلسے ہوا کرتے تھے ان ایوانوں میں خاک اڑنے لگی۔ وائی ایم سی اے کا حال بدحال ہو گیا۔ بی این آر آڈیٹوریم ایوب خاں کے دور کے ختم ہونے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ پاکستان کونسل کا حال رفتہ رفتہ ابتر ہوا۔ آخر کے تئیں اس ادارے ہی کا بستر لپٹ گیا۔ کافی ہاؤس میں تو بہت پہلے تالا پڑ گیا تھا۔ پھر چینیز بھی بند ہو گیا۔ پھر مال پر ایک ایک کر کے سارے ریسوراں بند ہو گئے۔ ٹی ہاؤس ٹائروں کی دکان بننے سے بال بال بچا۔ مگر کیا بچا۔ اس کا نقشہ حلقہ ارباب ذوق کے نقشہ سے ابتر۔ حلقہ ارباب ذوق کا نقشہ ٹی ہاؤس سے بڑھ کر ابتر۔ پھر ہمارا جی بھی محفلوں صحبتوں سے اچٹ گیا۔

ہاں نواز شریف کے دور ثانی کے ایک جلسہ کا ذکر سن لیجئے۔ نیا ہال نئے رنگ کے مقررین۔ ہال ادارہ حقوق انسانی کا کہ عین شاکر علی میوزیم کے سامنے تعمیر ہوا۔ مشعل نے کوئی بھلی سی کتاب چھاپی تھی۔ اس حوالے سے برداشت کے موضوع پر مذاکرہ ہو رہا تھا ایسے عالم میں کہ ہندوستان ایٹمی دھماکہ کر کے برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ چکا تھا اور پاکستان اس دبدا میں تھا کہ برداشت کا دامن چھوڑے یا پکڑے رہے۔

مذاکرے کے پہلے مقرر منو بھائی تھے۔ منو بھائی نے تقریر کرنے سے پہلے خبر سنائی کہ میں ابھی ابھی باہر سے یہ خبر سن کر آ رہا ہوں کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر دیا ہے۔

منو بھائی نے یہ خبر سنا کر اپنے ایک قیمتی سامع سے تو فوراً ہی ہاتھ دھو لیے۔ عبداللہ ملک فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے ''اچھا'' اتنا کہا اور یہ جا وہ جا۔ باقی لوگ بیٹھے رہے۔ مگر اب منو بھائی کی تقریر کسے سننی تھی۔ ادھر تقریر ہوتی رہی۔ ادھر پاکستان کے ایٹمی دھماکے پر یار لوگ کانا پھوسی کرتے رہے۔

خدا خدا کر کے منو بھائی کی تقریر ختم ہوئی۔ دوسرا مقرر تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ اسی آن ایک صاحب باہر سے لپکے ہوئے آئے اور خبر سنائی کہ لیجئے پاکستان نے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ یہ خبر اس مقرر پر بھاری پڑی۔ تقریر کر کے جلدی ہی بیٹھ گئے۔ مگر پھر یہ ہوا کہ جو مقرر تقریر کرنے مائیک کے سامنے آتا اسے ایک نئے دھماکے کی خبر تقریر سے پہلے آ لیتی۔ پانچویں اور آخری مقرر آئی اے رحمن تھے۔ وہ جب مائیک کے سامنے آئے تو خبر لانے والا خبر لایا کہ لیجئے پانچواں دھماکہ بھی ہو گیا۔ ہندوستان کے ساتھ معاملہ برابر ہو گیا۔ آئی اے رحمن نے بہت مایوسی کے لہجہ میں کہا کہ اس کے بعد کوئی بھی بات کرنے کی کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔ آخر کیا بات کی جائے' میں تو سمجھ نہیں پا رہا۔ اسی لہجہ میں مایوسی میں ڈوبے ہوئے چند فقرے اور بولے۔ رکے۔ میں سمجھا کہ وہ واپس آ کر اپنی نشست پہ بیٹھ جائیں گے۔ مگر پھر وہ بولتے ہی چلے گئے۔ اس شام انہوں نے اپنی زندگی کی شاید سب سے لمبی تقریر کی۔

اگلے دن مجھے اسلام آباد جانا تھا۔ وہاں کشور کی سرکردگی میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس نے ایک ڈرامہ فیسٹیول کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجھے اس میں شریک ہونا تھا۔ سہ پہر کو بیکٹ کے ایک مختصر ڈرامے سے اس کا آغاز ہوا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بیکٹ کا ڈرامہ ڈرامے کی اس تحریک کے واسطے سے پہچانا جاتا ہے جسے ایبسرڈ (Absurd) ڈرامے کا نام دیا گیا ہے۔ اردو میں اسے لایعنیت کا کھیل کہہ لیجئے۔ کھیل شروع ہونے لگا تھا کہ کشور یکا یک داخل ہوئی۔ میرے قریب آ کر کھلکھلا کر ہنسی۔ ''لو پاکستان نے چھٹا دھماکہ کر دیا۔'' اسی آن ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ بیکٹ کا لایعنی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ قہقہہ اور یہ خبر بیکٹ کے لایعنی کھیل ہی کا حصہ ہے۔

کتنے برس گزر گئے۔ مگر مجھے اب تک یہی لگ رہا ہے کہ جیسے میں پی این سی اے کے تھیٹر ہال میں بیٹھا ہوں اور بیکٹ کا لایعنی کھیل جاری ہے۔ یا الٰہی یہ ایبسرڈ ڈرامہ' یہ لایعنیت کا ناٹک آخر ہے یا شیطان کی آنت ہے' ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔

◆◆◆